ادب اور سماجی شعور

محمد خرم

Muhammad Khurram

Abstract:

Literature, if seen in a wider perspective, has been called “criticism of life”. A writer gets raw material and motivation from his environment and then moulds this raw material into a piece of art through his artistic skills. In this piece of art,some aspect of life is represented. So, literature becomes mirror to life.It is impossible to creat a great piece of art when someone is oblivious to social issues. A true writer refelcts the contemporary society even when he is writing about himself. If doesn’t fulfil the responsibility of truly reflecting life, he will never be immortal writer.

ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔اس حوالے سے وہ زندگی کی کلی اور جزوی ہر سطح پر عکاسی کرتا ہے۔وہ صرف زندگی کے مجموعی مسائل کو ہی بیان نہیں کرتا بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً ثقافت، معاشرت، مذہب، سیاست، تاریخ، تہذیبوں کے تصادم، اقدار کی شکست وریخت، فطرت، نفسیات اور ان جیسے متعدد دیگر عوامل کو بھی منظر عام پر لاتا ہے۔اس مناسبت سے ادب کو ایک ایسی سرگرمی قرار دیا جا سکتا ہے جو معاشرہ اور اس میں بسر ہونے والی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔اور ترجمانی کا یہ عمل محض جدید دور سے متعلق نہیں ہے بلکہ ادب میں زندگی کے اظہار کے مباحث اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ خود ادب کی تاریخ۔یہیں سے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے مباحث اور ان مباحث پر اُٹھنے والے سوالات کا آغاز ہوتا ہے۔

ادب دراصل سماج کی ہر حقیقت اور اس میں جنم لینے والی ہر تبدیلی کو منظر عام پر لا کر اپنا اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ادیب کبھی بھی اپنے معاشرے سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ادب اور زندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ایک سچا فنکار اپنے بارے میں لکھتے ہوئے بھی اپنے عہد کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے۔بعض اوقات ادب بھی فنکار کی شخصیت کے آئینے میں زندگی کی جھلک دکھا رہا ہوتا ہے۔فنکار کی اپنی شخصیت ضرور ہوتی ہے مگر وہ اس کے باوجود معاشرے کا ایک جزو بھی ہوتا ہے اور اُس کی زندگی معاشرے کے ساتھ مربوط بھی ہوتی ہے۔اگر یہ فنکار حساس ہو تو یہ ربط اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔اس طرح فن کار کا ذاتی بیان بھی ایک طرح سے معاشرے کا بالواسطہ اظہاریہ بن جاتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری کے مضمون ’’ادب اور زندگی‘‘ نے اپنے موضوع کے اعتبار سے ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔پھر مجنوں گورکھ پوری نے بھی اسی عنوان سے مضمون رقم کر کے اس نظریے کو مزید تقویت فراہم کی۔ادب اور زندگی کے موضوع پر اختر حسین رائے پوری کا مضمون نہایت قابلِ قدر ہے، مگر یہ نقطۂ آغاز نہیں۔اس بات کا اظہار مضمون کے آغاز میں خود مصنف نے بھی کر دیا ہے۔اختر لکھتے ہیں کہ:

> ’’ادب کیا ہے؟ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی؟ ادب کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ سوالات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی علم ادب کی زندگی۔ارباب حل وعقد نے اس مبحث پر بڑے بڑے دفتر سیاہ کر دیئے۔‘‘[1]

ایک ادیب جس معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے۔اُس کی حقیقتوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔وہ اردگرد کے ماحول اور اُس میں وقوع پذیر سیاسی، سماجی، ثقافتی، سائنسی غرض ہر طرح کی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اس کا اظہار الفاظ کی صورت میں کرتا ہے۔اس طرح ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ

دار بن جاتا ہے۔اس تناظر میں یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ ''ادب ایک ایسا سماجی عمل ہے جو زبان اور تخلیق کے حوالے سے بالواسطہ طور پر زندگی، معاشرے اور عوام کو متاثر کرتا ہے..... یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ ادب، قوموں، ملکوں اور لوگوں پر اپنا اثر ضرور مرتب کرتا ہے لیکن یہ اثر فوری یا براہِ راست نہیں ہوتا.....اس کا دائرہ اثر اتنا وسیع اور طریقۂ عمل اتنا بالواسطہ ہے کہ ان اثرات کا اعداد و شمار کے حوالے سے جائزہ لینا ممکن ہی نہیں۔''[۲]

ادب اور زندگی کی بحث میں دو سوالات نہایت اہم ہیں۔ادب میں معاشرہ کی اہمیت زیادہ ہے یا ادب کے ساتھ فرد کی اہمیت زیادہ ہے۔ادب اور معاشرہ یا ادب اور فرد؟ ادب اور سماج کا ربط تو لازم و ملزوم ہے ہی، مگر سماج سے پہلے ادب کے ساتھ فرد کا رشتہ بھی استوار ہوتا ہے۔ادب تخلیق کرنے والا ادیب بھی معاشرے کا ایک فرد ہی ہوتا ہے۔اس ادیب فرد کا دیگر افراد اور سماج کے مدارج کے ساتھ تعلق بھی ادب کے مباحث میں اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایک ادیب سب سے پہلے معاشرے کی معاشرت اور افراد کے تعلقات سے متاثر ہوتا ہے۔اس طرح وہ جو ادب تخلیق کرتا ہے وہ متاثر شدہ ہوتا ہے۔ معاشرہ اپنی سطح پر ثقافتی، عمرانی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی اقدار کے فروغ و زوال میں اپنا کردار تو ادا کر ہی رہا ہوتا ہے، بایں ہمہ وہ اُس فنکار کو بھی تحریک دے رہا ہوتا ہے جو کچھ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایسی تحریریں وجود میں آتی ہیں جو ثقافتی، عمرانی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی اُتار چڑھاؤ کی حامل ہوتی ہیں۔اس امر سے کوئی انکار نہیں کہ ہم ایک معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور معاشی نظام میں پرورش پاتے ہیں لیکن ادبی تخلیق معاشرہ نہیں کرتا فرد کرتا ہے جو بہت ہی پیچیدہ اور مختلف النوع عناصر سے ترتیب پاتا ہے اور مخصوص انداز میں متاثر ہوتا ہے اور اس طرح اپنی ایک منفرد شناخت بنا لیتا ہے یہ منفرد شناخت اسے دوسرے تخلیق کار سے الگ کرتی ہے اور یوں ہم ادب میں نت نئے تجربے کرتے ہیں۔[۳]

بہت سے پیچیدہ اور مختلف النوع عناصر کو ملا لینے سے یقیناً ادب اپنے اندر متاثر کرنے کی صلاحیت مجتمع کر لیتا ہے اور وہ اپنی منفرد شناخت بھی بنانے کے اہل ہو جاتا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ پراگندہ عناصر ایک ترتیب میں کیسے آئیں گے۔ادب کی تعمیر میں یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ اس کے عناصر کو اس طرح اکٹھا کیا جائے کہ بات نکلے تو قلم سے، مگر اثر دل پہ کرے۔اس اثر پذیری کے لیے مواد اور ہیئت کی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے۔صرف مواد ادب کو جنم نہیں دے سکتا ورنہ تو روزمرہ کے سوادِ سلف کی فہرست بھی ادب کے زمرے میں آ جائے گی اِسی طرح محض ہیئت بھی ادب کی دعوے داری نہیں کر سکتی کہ اس طرح تو محض تُک بندی بھی اعلیٰ شاعری شمار ہونے لگے گی۔مواد اور ہیئت کی اصطلاح دراصل زندگی اور ادب کی بحث ہے اور کوئی بھی ادب زندگی کے بیان کے بغیر ادھورا ہے بلکہ رضی عابدی کے خیال میں تو ادب سے سماجی وابستگی کا ہونا ہمارا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو طے شدہ معاملہ ہے۔وہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ:

> ''حقیقت یہ ہے کہ ادب اور سماجی وابستگی ہمارا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ ہمارے ادب میں ایسی کوئی روایت نہیں جہاں ادب کو سماجی تقاضوں سے علیحدہ رکھا گیا ہو۔مثنوی مولانا روم ہو یا داستانیں ہوں ہمارا تمام کا تمام ادب، نثری بھی اور شعری بھی، نہ صرف سماج سے وابستہ ہے بلکہ سماجی ذمہ داری کو بھی قبول کرتا ہے۔''[۴]

ادب کی سماج اور زندگی سے وابستگی محض مثنوی مولانا روم اور داستانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری کی پوری اصناف سماجی حوالہ لیے ہوئے ہیں۔ مرثیہ، قصیدہ، غزل، شہرِ آشوب، اور ایسی کچھ دیگر اصناف بھی خالصتاً سماجی حوالے کی حامل ہیں۔مرثیہ کو ہی لے لیجئے۔مرثیہ میں مختلف تفصیلات کا بیان صرف ایک مخصوص دور کے مذہبی سماج کو ہی پیش نہیں کرتا بلکہ ہر دور کے معاشرتی اور مذہبی رجحان کو منعکس کرتا ہے۔پھر اس صنف میں ہر دور کے بدلتے تناظر کے ساتھ سماجی تبدیلیوں کا عمل جاری رہا ہے جو ہیئت اور مواد دونوں حوالوں سے ہے وہ بھی نہایت اہم ہے۔قصیدہ اور غزل کا معاملہ بھی اِسی طرح سے ہے۔یہ دو اصناف بھی سماج کے مظاہر کی بڑی توانا مبلغ ہیں۔

غرض یہ کہ ادب سماج سے موضوعات لیتا ہے۔انھیں بیان کرتا ہے اور بعض اوقات نئے الفاظ، تراکیب، محاورات اور اصناف کو سماج کے کسی نہ کسی پہلو سے مستقل طور پر مربوط بھی کر دیتا ہے کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادب خلاء میں جنم نہیں لیتا۔ادب کا خالق سماج کا ایک حساس و ذمہ دار فرد

ہوتا ہے۔ شب و روز کے سماجی نشیب و فراز اور واقعات و حادثات اس کے تخلیقی ذہن کو مہمیز کرتے رہتے ہیں اور یوں اس کے فنکارانہ ذہن اور تخلیقی اُپج کی بہتر تشکیل و تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ادب اور سماج کا براہِ راست رشتہ ہے۔ جو ادب کو سنوارتا ہے۔ اِس طرح ادب ہماری زندگی کا ایک اہم جزو بننے کے علاوہ ہماری تہذیب و تمدن کا آئینہ بھی بن جاتا ہے۔[۵]

ادب، سماج اور زندگی کی تثلیث انسانی حیات کو بڑی حد تک اپنی حدود میں سمو لیتی ہے اور بات صرف یہیں تک نہیں رکتی بل کہ ان تینوں عناصر کا باہمی رشتہ معکوس ہے۔ ادب، سماج اور زندگی کو بیان کرتا ہے تو زندگی اور سماج بھی ادب کو نئی نئی راہیں دکھاتے ہیں۔ یہ راہیں طبیعات سے مابعد الطبیعات تک جاتی ہیں۔ ماورائی خیالات کا بھی ادب میں در آنا ادیب کے ماحول سے لاتعلق ہونے کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ ادیب کے ماحول کے ساتھ مضبوط رشتے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ تخیلاتی اور ماورائی عناصر چاہے ان دیکھی اور غیر حقیقی دنیاؤں سے تعلق رکھتے ہوں مگر ان کا وجدانی منبع تو یہی زمین اور سماج ہی ہے اور ادب سماج کی ہر حقیقت اور اس میں جنم لینے والے خیالات کو قرطاس کی سطح پر لا کر اپنا اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ آلِ احمد سرور کے مطابق ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی بھی ادیب اپنے عہد اور ماحول سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہ سماج کو ترقی کے راستوں پر لے جانے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ ادب اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر بھی غور کرتا ہے۔ اُن کا محاکمہ کرتا ہے اور اُن کو حل کرتا ہے۔[۶]

دنیا کے بڑے بڑے ادباء کی طرح برصغیر میں بھی ادیبوں نے ادب کو زندگی کی ترویج کا آلۂ کار بنایا۔ ان ادباء نے سماج میں ایک نئی روح پھونکی اور ادب کو مختلف اقدار سے مالا مال کیا۔ یہ اقدار سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی یا کسی بھی جہت سے تعلق رکھتی ہوں ادب نے ان کا پرچار کیا۔ اِسی خوبی کی بنا پر ادب زندگی کا آئینہ دار اور معاشرے کے حالات و واقعات کا عکاس قرار پایا۔ ادب زندگی کا بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح سے پرچار کرتا ہے۔ ادب جمالیات یا آرٹ کی کسی بھی قدر کی ترجمانی کر رہا ہو تو تب بھی وہ سماج اور زندگی کے ایک حصے کو ہی گرفت میں لے رہا ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ براہِ راست معاشرے کا انقلاب قاری کو دکھا رہا ہوتا ہے۔ وہ جلیانوالہ باغ کے پسِ منظر میں منٹو کا افسانہ ''تماشا'' ہو یا دلی کی ویرانی پر بہادر شاہ ظفر کا اُجڑے دیار کا نوحہ ہو، سوویت انقلاب کے بعد کا روسی ادب ہو یا ۱۸۵۷ء کے بعد کے مکتوباتِ غالب ہوں، ادب براہِ راست سماج اور زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں کو بیان کر دیتا ہے۔

ادب برائے زندگی کی بنیاد احساس ہے۔ ایک فنکار عام فرد کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کے واقعات کو اُس طرح سے محسوس کرتا ہے نہ دیکھتا ہے، جس طرح ایک عام فرد دیکھتا ہے۔ دلی پر نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کی یلغار نے جو چوٹ میرؔ کے حساس ذہن پر لگائی وہ دلی کی عام رعایا کے ذہن پر نہیں لگی۔ جو کسک اور بے توقیری میرؔ نے حاکمِ وقت کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھ کر محسوس کی وہ دیگر ناظرین کے بس میں نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ ایک کوہستانی سفر کے دوران مجید امجد ایک تنگ پہاڑی موڑ پر ایک درخت کی شاخوں کے سہارے کو ایک نورانی فرشتے کا ہاتھ اس لیے قرار دیتے ہیں کہ وہ ایک حساس شاعر ہیں۔ حالانکہ یہ منظر ہم میں سے کئی لوگوں نے کئی بار دیکھا ہوگا، مگر اِسے ایک فطری عمل سمجھ کر آگے بڑھ گئے ہوں گے، مگر اس کا درست ادراک اور احساس ایک فنکار ہی کر سکتا ہے اور فنکار کو یہ صلاحیت ادب کی عطا کردہ ہے۔ اگر احساس نہ صرف ادب بلکہ ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو ہمارے اردگرد پھیلے اور بکھرے ہوئے ہزاروں لاکھوں بے کسوں کی بدحالی، مظلومیت اور حالتِ زار ادب میں کیوں نہ آئے؟ سماج کے چہرے پر لگے ہوئے مفلسی، محتاجی، لاقانونیت، جبر و استعداد، استحصال اور ایسے دیگر داغوں کو دھونے کے لیے پہلے ان کی نشان دہی ضروری ہے۔ ادب شاعری، ناولوں، افسانوں اور دیگر اصناف کے ذریعے دراصل اِن کی نشاندہی ہی تو کرتا ہے۔ اس طرح ادیب ادب کو زندگی کے ساتھ جوڑتا ہی نہیں بل کہ اس کے اندر تک پیوست کر دیتا ہے اور اِسی بات کا اظہار ''ادب اور انقلاب'' کے پیش لفظ میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے کیا تھا:

> ''ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اِسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔''[۷]

اب جب کہ زندگی مسلسل تغیّر وتبدّل کی کہانی ہے تو ادب کو بھی زندگی کے بدلتے دھاروں کے ساتھ شامل ہونا پڑے گا اور ادب اِس شمولیت سے کسی طور بھی مفرور نہیں بل کہ ادب سماج میں آنے والی ہر طرح کی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ بعض اوقات سماجی تبدیلیاں ادب کے دھاروں کو بھی بدلتی ہیں۔ بیسویں صدی کے مسائل غزل کی نسبت نظم میں زیادہ بہتر طور پر ادا ہو سکتے تھے تو نظم کو قبولِ عام ہوا۔ اِسی طرح دکنی عہد میں طویل رزمیہ واقعات کے بیان کے لیے مثنوی کی صنف موزوں اور غالب نظر آتی ہے۔ سماج ادب کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بل کہ اسے اظہار کی راہیں بھی دکھاتا ہے۔

ہر زبان کے ادب کی تفہیم اُس دور کے معاشرے کے ساتھ مربوط ہوتی ہے۔ میرؔ کے ہاں دلی کے لیے دل کا استعارہ اُس دور کے سیاسی و معاشرتی حالات کا عکاس ہے۔ اِسی طرح ترقی پسندوں کی آواز اُن کے عہد کے نام نہاد حکمرانوں کی سماج دشمنی کا پردہ چاک کرتی ہے۔ سنسکرت شاعری اور ادب قدیم ہندی اساطیر کے حوالے کے بغیر ادھورا رہے گا اور یہی ہندی اساطیر ادب میں نئے حوالوں کا باعث بھی بنتے ہیں کیونکہ اپسرا کی جگہ طوائف اور راکشس کی جگہ جدید مشینوں نے لے لی۔ ڈولیوں کی جگہ موٹریں آ گئیں۔ کہاروں کی جگہ ڈرائیوروں نے لے لی۔ یہ معاشرتی جدت ادب کو بھی بدلنے کا پیغام دیتی ہے لہذا بہتر یہ ہوگا کہ اب ہمارا ادب بھی اپنے بہاؤ کے لیے نئے میدان اور نئی راہیں تلاش کرے۔

سماج بہت سے افراد کا مجموعہ ہوتا ہے مگر ان کا رہن سہن اور طرزِ زندگی کے مختلف شعبہ جات میں ایک اشتراک پایا جاتا ہے۔ یہی اشتراک ایک سماج کی تشکیل کرتا ہے مگر ہر سماج میں مختلف عناصر اور پہلو پائے جاتے ہیں۔ ادب کا کام یہ ہے کہ وہ سماج کو کلی اور جزوی ہر دو سطح سے اپنی گرفت میں لے اور ادب یہ فریضہ انجام بھی دے رہا ہے۔ کوئی بھی سماج ہو اُس کا معاشی پہلو بھی ایک اہم جہت ہوتا ہے اور ادیب اِس کی اہمیت سے قطعی غافل نہیں ہوتا۔

ضروریاتِ زندگی کا حصول اور ذرائع کی تقسیم اگر سماج کا اہم مسئلہ ہے تو اس کا بیان ادب کے لیے بھی ضروری قرار پائے گا۔ معاشی حوالے سے سماج کی تقسیم دو بنیادی حصوں میں ہوتی ہے۔ ایک خواص کی اور دوسری عوام کی۔ خواص میں امراء شامل ہیں اور عوام میں عام افراد، جمہور، صوفی، جوگی، بیراگی اور محنت کش وغیرہ۔ ان دو طبقوں کی تقسیم اور اثرات زمانۂ قدیم سے لے کر گذشتہ صدی تک علم و ادب پر موجود رہے۔ طبقۂ خواص یا امراء کا زندگی کی تگ و پو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نا آشنا تھے اور ''آشرموں یا حجروں میں اور درباروں یا امیروں کی ڈیوڑھیوں میں پڑے ہوئے یہ عالم اور ادیب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کیا کوشش کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں رہتے تھے جو یا تو زندگی سے دور تھا یا جھوٹی زندگی کا عکاس تھا۔''[8]

افراد زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر اپنے قصائد سننے اور کہنے میں مگن تھے لیکن اِس عالمِ غفلت میں بھی کچھ صوفی شعراء اور بھگت عوام کی جذبات کی ترجمانی کرتے رہے۔ یہ حضرات طبقہ امراء کی تحسین و ستائش کرنے کی بجائے سماج کی تصویریں پیش کرنے میں مگن رہے۔ اگرچہ ''کبیر داس اور نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر خال خال ہی ہوئے ہیں، جو گھوم پھر کر آپ اپنی روٹیاں کماتے اور زندگی کو کوچۂ یار میں رہ کر نہیں بلکہ قدرت کے نگار خانہ میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔''[9] اور زمانے نے بھی پھر اِنھی عوامی جذبات کے ترجمان فنکاروں کی ہی قدر کی ہے اور درباری بھاٹوں اور مسخروں کو اُن کے درباری ماحول سمیت رد ہی کیا ہے۔ اِس طرح ادب کو آزاد کرانے میں بھی سماج کا ہی ایک اہم کردار بنتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ادب کو ہر طرح کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے اِسے عوام کے مسائل کے قریب لایا جائے تا کہ ادب معاشرے کے افکار و نظریات کی سچی عکاسی کرے جو کہ اِس کا حقیقی منصب بھی ہے جبکہ اِس کے برعکس ''ادب اگر ملک اور زمانے کے تازہ ترین فکریات (IDEOLOGY) یعنی اجتماعی خیالات و افکار کا حامل نہیں تو وہ صحیح معانی میں ادب نہیں۔''[10]

ادب مقصدیت کا پرچار ضرور کرتا ہے مگر اس میں جمالیاتی قدریں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اگرچہ جمالیاتی اقدار کے ذکر سے ادب برائے ادب کی تحریک ہوتی ہے، مگر یہ زندگی اور مقصد سے بھرپور تحریری خوبیوں کی حامل ہوگی تو ادب کہلائے گی۔ ویسے ادب مقصد کے بغیر بھی زندگی کے دائروں کو حصار

ہوتا ہے۔ مثلاً سرشار کا ناول ''فسانۂ آزاد'' یا میر اور غالب کی سماجی شاعری، جس میں شعوری طور پر کوئی اصلاحی مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، مگر اس شاعری میں اپنے زمانے کی روح بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر فن کار میں ذرا سا بھی خلوص ہو تو وہ زندگی سے الگ نہیں ہو سکتا۔[۱۱]

ایک سچا فنکار اپنے بارے میں لکھتے ہوئے بھی اپنے عہد کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے۔ بعض اوقات ادب فرد کی شخصیت کی آئینے میں زندگی کی جھلک دکھا رہا ہوتا ہے۔ یہ فرد خود فن کار بھی ہو سکتا ہے۔ فرد کی اپنی شخصیت ضرور ہوتی ہے مگر وہ اس کے باوجود معاشرے کا ایک جزو بھی ہوتا ہے اور فرد کی زندگی معاشرے کے ساتھ مربوط ہوتی ہے اور اگر یہ فرد ایک حساس فن کار ہو تو یہ ربط اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ اس طرح فن کار کا اپنا بیان بھی معاشرے کا بالواسطہ اظہاریہ بن جاتا ہے جس کے متعلق حسن عسکری یوں رقم طراز ہیں:

> ''فن کار محض ایک آدمی نہیں ہوتا، فن کار تو براہِ راست زندگی کا آلۂ کار ہے۔ وہ ایک معمل ہے جہاں زندگی تجربے کرتی ہے .....اس لیے فن کار کی تخلیقات کو ایک آدمی کی رائے نہیں سمجھنا چاہیے۔''[۱۲]

ہر ادب میں بعض اصناف زیادہ مقبولیت حاصل کرتی ہیں۔ یہ معاملہ صرف مختلف زبانوں کے ادب تک محدود نہیں بلکہ ایک ہی زبان کے ادب میں مختلف عہد میں مختلف اصناف زور پکڑتی نظر آئیں گی اُردو میں قدیم دکنی دور مثنوی کا دور ہے اور نثر میں دیکھا جائے تو تمثیل اور داستان کا غلبہ رہا ہے۔ حتیٰ کہ مذہبی اور اخلاقی تصنیفات یا خود داستانوں میں بھی تمثیل شامل رہی ہے۔ سب رس، ''قطب مشتری''، ''منطق الطیر'' اور ایسی دیگر تصنیفات بطور مثال ہیں۔ اس کے بعد بیسویں صدی نظم کی صدی معلوم ہوتی ہے اور اس سے پہلے غزل کی صنف چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے جدید سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کے لیے جدید نظم موزوں معلوم ہوتی ہے، مگر اس سے پہلے اشاروں کنایوں اور علامات کے ذریعے اپنے عہد کی سیاسی و سماجی آویزش کے بیان کے لیے غزل مناسب معلوم ہوتی رہی۔ اصناف کے اس مد و جزر میں سماج کے رد و قبول اور فکری اُتار چڑھاؤ کا دخل تو ہے ہی، مگر زندگی کی ترجمانی کے لیے موزوں پیمانوں کی تلاش نئی اصناف کو جنم دیتی ہے اور سابقہ اصناف کو آگے پیچھے بھی کرتی ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کا بیان جب حقیقت نگاری کے ساتھ کرنا مشروط ہو گیا تو داستان کے قصے کہانیوں کی بجائے مغرب سے آئے ہوئے ناول کو اپنانا پڑا اور یوں داستان سے افسانے تک کا سفر شروع ہوا لیکن کسی بھی زبان کا ادب ہو اور کوئی بھی صنفِ نظم و نثر ہو، ہر بڑا ادیب اپنے گرد و پیش سے کٹ کر نہیں رہ سکا بلکہ ماحول کی عکاسی اپنی تحریروں میں ضرور کرتا آیا ہے۔

ہومر، چاسر، دانتے، کالی داس، ایلیٹ، میتھیو آرنلڈ، میر، غالب، اقبال سب نے اپنے فن کو اپنے سماج سے مربوط کیے رکھا۔ بعض بڑے جمالیات پرست جو فن کو جمالیات کا امین قرار دیتے ہیں وہ بھی اپنے جمالیاتی فن پاروں میں کسی نہ کسی طرح سماجی زندگی کے کسی نہ کسی شعبے کی عکس بندی کر جاتے ہیں۔ مثلاً ''آسکر وائلڈ، جمالیات اور فن کا امین جب ''بلبل اور گلاب'' لکھتے ہوئے اُس مقام پر پہنچتا ہے جہاں امیر لڑکی اپنے غریب عاشق کا نذرانہ ایک پھول .....بلبل کے خونِ جگر سے سینچا ہوا پھول لینے سے اس لیے انکار کر دیتی ہے کہ اس کے ایک امیر عاشق نے اسے قیمتی جواہرات لا کر دیئے ہیں تو وہ بقول ایک نقاد ''خالص جمالیات کے بے جان خلا سے نکل کر سماجی زندگی اور طبقاتی کش مکش کی دھڑکتی فضا میں داخل ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔''[۱۳]

اُردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ ادب نے زندگی کے گوناگوں تجربات کو اپنی تحویل میں لیا۔ بایں ہمہ زندگی نے بھی ادبی راہوں کو متعین کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد معاشرتی اور سیاسی انقلاب نے ہر شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا۔ ایسی صورت میں ادب کا انقلاب سے آنکھیں بند کیے رہنا ناممکن تھا۔ یہ انقلاب جہاں زرخیز ذہنوں کے لیے تازیانہ تھا وہیں نئے زاویے اور نئی راہوں کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا۔ اِس ادبی انقلاب کے تناظر میں بنیادی محرک برصغیر پر مسلمانوں کے عہدِ زریں کا زوال اور انگریزوں کے آفتاب کا سرِ آسمان آنا تھا۔ چنانچہ مسلمان سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی طور پر روبہ زوال ہوئے۔ یہ بدحالی دو صورتوں میں شدت کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ ایک تو مسلمان جدید تعلیم کو شجرِ ممنوعہ سمجھنے لگے اور دوسرا زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کے لیے واہ واہ کے ادب میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ ایسی تحریریں جو غم کو غلط بھی کریں اور پریشان بھی قابلِ تحسین سمجھی جانے لگیں۔ مقصدیت اور زندگی کے معاشرتی و سیاسی مسائل سے آنکھیں چرائی جانے لگیں۔ اگر کسی سیاسی یا مقتدر شخصیت پہ تنقید کی بھی گئی تو اُس کی وجہ اُس شخصیت کا شاعروں اور مشاعروں سے بے اعتنائی تھی۔ ایسے حالات میں سرسید

اور اُن کے رفقاء کی تحریریں اپنے اپنے اسالیب میں ادب کا ناطہ زندگی سے جوڑتی ہیں۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین ''رسالۂ اسباب بغاوتِ ہند''، ''مسدسِ حالی'' اور نذیر احمد کے اصلاحی ناول، ایسی کاوشیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں کو راہِ راست پر لانے کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی زندگی کی راہ پہ گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور یہ صرف اُردو ادب کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دیگر زبانوں کے ادب میں بھی یہ صورتِ حال ملتی ہے۔ ادیب اپنے زمانے کی منظر کشی اور اِس تناظر میں مستقبل کی پیش بینی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ ایسا انحطاطی دور جس میں ادب کے سوتے سماجی حوالے سے خشک ہونے لگتے ہیں تب بھی بعض مقامات پر ادیب اپنے زمانے کی حقیقت بیان کر ہی رہا ہوتا ہے کیونکہ بقول اے۔ بی۔ اشرف:

> ''دنیا کے کسی ادب کا غور سے مطالعہ کیجئے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ادیب اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کبھی دامن نہیں بچا سکا اور اس زمانے کی زندگی کے بھرپور نقوش اس کی تخلیقات میں نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اُردو غزل ہی کو لیجئے اُس وقت بھی جب اُسے محض گُل و بلبل کے مضامین تک ہی محدود سمجھا جاتا تھا اور اُس کا مفہوم ''گفتن بزنان'' لیا جاتا تھا یہ اپنے دامن میں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو سمیٹے ہوئے تھی۔''[۱۴]

ادب کا زندگی اور سماج سے تعلق صرف حقیقت کا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ بعض اوقات اور بعض مقامات پر ہدایت کا بھی فریضہ انجام دیتا ہے۔ ادبی تخلیقات خارج سے موضوعات کو کشید کرتی ہیں اور یہ صرف اِسی حد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ خارج میں چھپے اُن محرکات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں جو ماحول کو تعمیر کر رہے ہوتے ہیں اور اگر اس تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہو تو ادب ایک رہنما کا انداز بھی اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا دائرہ کار پھر محدود نہیں رہتا۔ اس میں اتنی وسعت آ جاتی ہے کہ یہ تصوف، مذہب، معاشرت، اخلاق، فلسفہ، سیاست، معیشت، تاریخ غرض ہر پہلو کا بیان کرتا ہے۔ مثلاً ملٹن، دانتے، مولانا روم، علامہ اقبال اور اکثر صوفیاء کے ہاں سماجی اور مذہبی موضوعات کی بہتات ہے۔ ہومر، چاسر اور دکنی شعراء کے ہاں تاریخ اور کہانی سے رغبت ملتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا ادب، پھر تقسیمِ ہند اور تقسیمِ پاکستان کے آس پاس کا ادب پورے پورے سیاسی منظر نامے لیے ہوئے ہے۔ غرض ادب کا سماج کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر پہلو سے تعلق ہے کیونکہ ادب سماج اور زندگی دونوں کی ایک بیانیہ صورت ہے اور سماج اور زندگی تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اس لیے ادب کا بھی کوئی ایک شعبہ نہیں بلکہ یہ کل زندگی پر محیط ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ''ادب کا آج تک کوئی موضوع متعین نہیں کیا جا سکا۔ اس لیے کہ اس کا کوئی ایک موضوع ہے ہی نہیں۔ ادب کا موضوع زندگی ہے۔ زندگی بڑی متنوع ہوتی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ معاشرتی، معاشی، سماجی، اخلاقی، تعلیمی، مذہبی غرض زندگی گوناگوں کیفیات کی حامل ہے اور زندگی کی یہی گوناگونی اور تنوع ادب کا موضوع ہے۔[۱۵]

وقت کے ساتھ ساتھ انقلابات جنم لیتے ہیں۔ یہ انقلابات زندگی کے ہر شعبے اور سطح پر نمودار ہوتے ہیں۔ پھر اِن کی شدت میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے۔ اب جبکہ ادب زندگی کا ترجمان ہے تو اسے چاہیے کہ زندگی کے ہر شعبے کی ترجمانی کرے اور فی الواقع ہمارے معاشرے اور عہد کو ضرورت بھی اُس ادب کی ہے جو ''زندگی کی سچی نمائندگی کر سکے۔ جو ہماری مادی اور عمومی زندگی کے ہر رُخ کو اپنا موضوع بنائے اور اس میں تخیلی رنگ بھرے۔''[۱۶]

زندگی کی سچی نمائندگی اُسی صورت میں ممکن ہے جب صرف ادب برائے ادب کی ضد نہ لگائی جائے بلکہ ادب کو زندگی کے ہر شعبے کا عکاس قرار دیا جائے تاکہ ادب معاشرے کی ترویج و ترقی اور اصلاح میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔ ایک زیرک ادیب اپنے قاری تک زندگی کے معاملات اور مسائل کو پہنچانے کا فریضہ بخوبی انجام دیتا ہے۔ البتہ زندگی کے اِن گوناگوں مسائل کی پیش کش کے طریقۂ کار میں فرق ہو سکتا ہے۔ اس حوالے سے بھی کئی نقطۂ نظر موجود ہیں۔ زیادہ اہم علم الحقیقت اور علم الہدایت ہیں۔ یعنی زندگی کے معاملات کو ایسے پیش کیا جائے جیسا کہ وہ ہیں یا اُنھیں ایسے پیش کیا جائے جیسا کہ اُنھیں ہونا چاہیے۔ ادیب معاشرے کی ہو بہو عکاسی کرے یا اس میں تخیل کی رنگ آمیزی سے امکانات پیدا کرے؟ اور یہ سوال صرف موجودہ ادب کے ساتھ نہیں، اس کے جواب میں دلائل قدیم ادب سے بھی مل سکتے ہیں۔ جیسے زمانۂ قدیم میں سوفوکلیز نے کہا تھا کہ ''میں نے ایسے کردار پیش کیے جیسے کہ ہونے چاہیں جب کہ یوری پیڈس نے ایسے کردار پیش کیے جیسے کہ وہ ہیں۔''[۱۷]

گویا سوفوکلیز نے کرداروں کو ایسے نہیں پیش کیا جیسے کہ وہ ہیں بلکہ اُن میں تخیل سے رنگ آمیزی کی ہے، جبکہ یوری پیڈس نے معاشرے کی ہو بہو عکاسی کر دی ہے۔ ہو بہو عکاسی بھی ایک اہم بات ہے، لیکن اگر ناقدانہ انداز سے دیکھا جائے تو چیز کو ایسے پیش کرنا جیسے کہ اُسے ہونا چاہیے دراصل معاشرے کی تعمیر ہے اور اِس طرح یہ عمل ہو بہو عکاسی سے ایک قدم آگے ہے۔ سر فلپ سڈنی بھی اُن لوگوں کو بیکار سمجھتے ہیں جو شاعری کو جھوٹ کا پلندا کہتے ہیں اور اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہوتی ہے کیونکہ شاعر تو تخلیق کرتا ہے یعنی یہ دکھاتا ہے کہ چیزوں کو کیسا ہونا چاہیے؟ اس لیے جھوٹ اور سچ کا تو اس سلسلے میں سوال ہی نہیں اُٹھتا۔[۱۸] یہاں چیزوں کو کیسا ہونا چاہیے کا معاملہ ارسطو کے نظریات سے ماخوذ ہے جو یہ کہتا ہے کہ:

> ''شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ جو کچھ حقیقت میں گزرا اس کو فی الواقع جوں کا توں بیان کر دے بلکہ ایسی چیزیں بیان کرنا ہے جو ہو سکتی ہیں۔''[۱۹]

چنانچہ اس طرح ادب کا مقصد صرف زندگی کی عکاسی تک محدود نہیں رہ جاتا بلکہ اسے زندگی اور سماج کی تشکیل کا فریضہ بھی انجام دینا پڑتا ہے جس کے لیے ادیب کو ہر طرح کی پابندیوں اور دباؤ سے آزاد ہو کر قلم سنبھالنا پڑتا ہے کیونکہ:

> ''ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے۔ اسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چوبچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔''[۲۰]

اور اگر آج کا ادیب یہ علَمِ جہاد بلند نہیں کرتا ایمان داری اور صداقت کے مشرب کو نہیں اپناتا اور ادب کا تعلق زندگی سے کسی طور نہیں جوڑتا تو ایسی حالت میں عام آدمی ادب کو بے معنی سرگرمی سمجھنے لگے گا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سماج اندر سے بہت کھوکھلا، بیمار اور قریب المرگ ہے۔ لہٰذا معاشرے کو زندہ رکھنے کے لیے ادب کو معاشرے کا ترجمان ہونا ہی پڑے گا۔ کیونکہ ادب کا زندگی اور سماج سے تعلق صرف حقیقت کے بیان کا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ بعض اوقات ہدایت کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ اس طرح ادب کا سماج کے ہر شعبے سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ ادب، سماج اور زندگی دونوں کی ایک بیانیہ صورت ہے، جو کسی تخصیص کے بغیر زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔

حواشی

۱ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب (بمبئی: نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز لمیٹڈ، س ن)، ص ۱۰

۲ ڈاکٹر انور سدید، اختلافات (لاہور: مکتبۂ اردو زبان، ۱۹۷۵ء)، ص ۲۷۔۲۸

۳ دیویندر اسر، ''ادب اور صحیح ادب''، مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، مرتبہ محمد خاور نوازش (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۱۰۴

۴ رضی عابدی، ''ادب اور سماجی وابستگی''، مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، ص ۲۲۷

۵ صالحہ زریں، اُردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ابتداء سے ۱۹۴۷ء تک (الٰہ آباد: سرسوتی پریس، ۲۰۰۰ء)، ص ۴۹

۶ آلِ احمد سرور، بحوالہ اُردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ابتداء سے ۱۹۴۷ء تک، ص ۴۷

۷ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص ۸

۸ ایضاً، ص ۲۰

۹ ایضاً، ص ۲۱

۱۰ مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۶۹ء)، ص ۵۶

۱۱ شعیب عتیق خان، فسادات ۱۹۴۷ء اور اُردو کا افسانوی ادب (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۶ء)، ص ۴۷

۱۲ محمد حسن عسکری، انسان اور آدمی (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء)، ص ۲۷

۱۳ اے۔بی۔اشرف، ادب اور سماجی عمل (ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۸۰ء)، ص ۲۶

۱۴ ایضاً

۱۵ ایضاً، ص ۳۰

۱۶ مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی، ص ۹۲

۱۷ ڈاکٹر جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۸

۱۸ سر فلپ سڈنی، بحوالہ ارسطو سے ایلیٹ تک، ص ۲۳۸

۱۹ ارسطو، بحوالہ ارسطو سے ایلیٹ تک، ص ۲۳۸

۲۰ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص ۲۵